غزل بہانہ کروں

احمد فراز

غزل بہانہ کروں

احمد فراز

GHAZAL BAHA NA KARON

(Urdu Poetry)

by

AHMAD FARAZ

Year of Edition 2002
ISBN-81-87666-24-2
Price. Rs. 80/=

نام کتاب	غزل بہانہ کروں
مصنف..	.احمد فراز
سن اشاعت.	...۲۰۰۲ء
قیمت....	.۸۰روپے
مطبع	.کاک پرنٹرس، دہلی

Published by:
Kitabi Duniya
1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)
E -mail kitabiduniya@rediffmail.com

ڈاکٹر مہندر
کے نام

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

ترتیب

آتش فشاں — سید ضمیر جعفری ۹
عرضِ غم کبھی اس کے روبرو بھی ہو جائے ۱۵
جب تجھے یاد کریں کارِ جہاں کھنچتا ہے ۱۷
کل ہم نے بزمِ یار میں کیا کیا شراب پی ۱۹
جس کے لیے ہیں جاں بلب اس کو نہیں ملال بھی ۲۱
چلی ہے شہر میں کیسی ہوا اداسی کی ۲۳
کل نالۂ قمری کی صدا تک نہیں آئی ۲۵
یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے ۲۷
ہم کہ منت کشِ صیاد نہیں ہونے کے ۲۹
پھر ترے نہ آنے کی خبر شام میں آئی ۳۱
نہ تیرا قرب نہ بادہ ہے کیا کیا جائے ۳۳
میں مر مٹا تو وہ سمجھا یہ انتہا تھی مری ۳۵
شہرِ محبت' ہجر کا موسم' عہدِ وفا اور میں ۳۷
جانے نشے میں کہ وہ آفتِ جاں خواب میں تھا ۳۹
نہیں کہ نامہ بروں کو تلاش کرتے ہیں ۴۱
وہ جو آ جاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر ۴۳
آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی ۴۵

ب

کرتے بھی کیا جانا پڑا پھر سے اسی قاتل کے پاس ۴۷
کسی سے دل کی حکایت کبھی کہا نہیں کی ۴۹
مسافرت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں ۵۱
وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ ۵۳
تیرا غم اپنی جگہ دنیا کے غم اپنی جگہ ۵۵
کیوں طبیعت کہیں ٹھہرتی نہیں ۵۶
اس کی نوازشوں نے تو حیران کر دیا ۵۸
اک شام ہے انتظار جیسی ۶۰
لگتا ہے کہ اب چاہتیں آساں ہیں زیادہ ۶۳
ہم اہلِ دل کو بھی کردار کیا دیے گئے ہیں ۶۵
کل پرسشِ احوال جو کی یار نے میرے ۶۷
منزلیں ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں ۶۸
چلو کہ کوچۂ دلدار چل کے دیکھتے ہیں ۷۰
یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم ۷۲
غزل سن کر پریشاں ہو گئے کیا ۷۴
دو گھونٹ کیا پیے کہ بدن میں لگی ہے آگ ۷۶
جو بھی قاصد تھا وہ غیروں کے گھروں تک پہنچا ۷۸
عاشقی بے دلی سے مشکل ہے ۸۰
ملول کر ہمیں اتنا ملول کر جاناں ۸۲

ج

دل ٹھہرنے دے تو آنکھیں بھی جھپکتے جاویں ۸۴
ہیں زخم بہت اور بھی دل پر مرے آگے ۸۶
کل شب تھا عجب دید کا منظر مرے آگے ۸۹
نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے ۹۲
دشتِ افسردہ میں اک پھول کھلا ہے سو کہاں ۹۴
ہم بھی مانگیں مراد ہو کچھ تو ۹۶
کچھ ہمیں اس سے جان کر نہ کھلے ۹۷
وحشتِ دل طلبِ آبلہ پائی لے لے ۹۹
چشمِ گریاں میں وہ سیلاب تھا اے یار کہ بس ۱۰۱
اتنے بھی تو وہ خفا نہیں تھے ۱۰۳
تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے ۱۰۵
شعار اپنا ہی جس کا بہانہ سازی تھا ۱۰۷
یوں دل سے کسی درد کا پیماں نہیں کرتے ۱۰۹
دل سلگتا ہے مگر سوختہ جانی کم ہے ۱۱۱
جو چل سکو تو کوئی ایسی چال چل جانا ۱۱۳
اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا ۱۱۵
ہم سنائیں تو کہانی اور ہے ۱۱۷
نہ منزلوں کو نہ ہم رہگزر کو دیکھتے ہیں ۱۱۹
گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دہن تم جیسے ۱۲۱

د

کبھی جو راحتِ جاں تھا اسے بھلا بھی دیا ۱۲۳
اشک تعبیر اور خواب ہنسی ۱۲۴
زخم ہجراں کا بھر گیا کچھ کچھ ۱۲۶
یہ بے دلی ہے تو کشتی سے یار کیا اتریں ۱۲۷
کسی کی یاد میں اتنا نہ رو ہوا سو ہوا ۱۲۹
ہنگامۂ محفل ہے کوئی دم کہ چلا میں ۱۳۱
نہ تو دیوانے ہی بن پائے نہ دانا مرے دوست ۱۳۳
وہ تو پتھر پہ بھی گزرے نہ خدا ہوتے تک ۱۳۵
خوش کون رہا پوششِ ہجراں کو پہن کر ۱۳۷
نامہ تو ہم نے بھیجا ہے اس کو صبا کے ہاتھ ۱۳۹
پھرا ہوں سارے زمانے میں دربدر کیسا ۱۳۱
کیوں نہ ہم عہدِ رفاقت کو بھلانے لگ جائیں ۱۳۳
چاہت کے صبح و شام محبت کے رات دن ۱۳۵
پھرتے ہیں اب بھی دل کو گریباں کیے ہوئے ۱۵۳
صد رنگ چمن دیدۂ حیراں میں بھرے تھا ۱۵۵
حیرت ہے لوگ اب بھی اگر خوش عقیدہ ہیں ۱۵۷
دل بدن کا شریکِ حال کہاں ۱۵۹
ایک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہنستا جاتا ۱۶۱
وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سبھی رنگ اتار کے شہر کا ۱۶۳

آتش فشاں

احمد فراز کے تذکرے کے لئے ---- کہ جواب کتابوں میں نہ سما سکے ---- تفصیل تو کجا، مجھ سے آپ کسی ترتیب کی بھی توقع نہ رکھیں۔ قدرت نے، اپنی بے شمار نوازشات میں ایک کرم مجھ پر یہ بھی کر رکھا ہے کہ میں غلط فیصلے بھی ٹھیک وقت پر کرتا ہوں۔ سو، میں نے پہلے فراز کی ذات پر بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کہ فراز کی شاعری کا تذکرہ مجھ پر نسبتاً سہل بھی ہو گا۔ سہل اس لئے کہ مجھے تجزیاتی سمندروں کے پانیوں میں نہیں اترنا۔ اس کی شاید ضرورت بھی نہیں کہ فراز تو اب شاعری کے اس مقام پر ہے جہاں وہ اپنے معیار خود بنا سکتا ہے۔

فراز سے پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء میں ایبٹ آباد کی پہاڑی پر ---- خان فقیرا خان جدون کے حجرے میں ہوئی جو صوبہ سرحد کی ایک اہم دلچسپ اور پراسرار صحافتی، سماجی اور سیاسی شخصیت تھے۔ محسن احسان بھی ساتھ تھے۔ موسم برسات کی یہ شام باہر کی طرح اندر بھی خاصی بھیگی رہی۔ یہ دونوں ان دنوں، اپنی جوانی اور شاعری کی دہلیز پر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ دونوں کے چہروں کی طرح دونوں کی شاعری بھی چونکا دینے والی تھی۔ میٹھے دونوں تھے۔ مگر محسن احسان دھیما اور شرمیلا۔ فراز، شوخ و شنگ ---- شگفتہ۔ چھب دلبرانہ، ڈھب جارحانہ۔ آدمی اس سے مل کر بھول نہ سکتا۔ نہ اس کو نہ اس کی شاعری کو۔ فراز ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے، جو پروفیسر شوکت واسطی اور راقم نے "کشمیر فنڈ" کے لئے برپا کیا تھا ایبٹ آباد آئے تھے۔ مشاعرے میں دو شاعروں ہی سے سامعین کے اصرار پر کشمیر کے موضوع کے علاوہ ان کی مقبول نظموں کی فرمائش کی گئی۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری سے "بوڑھی رقاصہ" کی اور احمد فراز کی نوجوان "لحی ہ" کی۔

اس مشاعرے کا یہ حیران کن منظر بھی مجھے یاد ہے کہ مشاعرے کے اختتام پر "آنو

گراف" لینے کا جتنا ہجوم حفیظ صاحب کے گرد تھا اتنا ہی ہجوم فراز کے گرد تھا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس لڑکے کو زیادہ تر کالج کی طالبات نے گھیر رکھا تھا۔ غالباً" اس کی شاعری کے ساتھ اس کی شکل بھی سامعین کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

اگلے دن نمبر ۹ فرنٹیر ڈویژن کے ہمارے جنرل آفیسر کمانڈنگ (GOC) اور صدر مشاعرہ جنرل نذیر احمد بھی خاصی دلچسپی کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹرز میں چائے پر اپنے گورے "جی ون" (G-1) کرنل بلیک اور ہم دیسی سٹاف افسروں میجر زین الدین اور کیپٹن (اب ریٹائرڈ بریگیڈیئر) قیوم کے سامنے فراز کا تذکرہ کرتے رہے۔ گویا طالبات ہی نہیں جرنیل بھی اس سے متاثر ہوا۔ جنرل صاحب کو کیا معلوم تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر بھی جرنیلوں کو متاثر کرے گا مگر کچھ دوسرے قرینے سے۔

احمد فراز سے ہمارے تعلقات نشیب و فراز سے خالی نہیں۔ ابتداء محبت سے ہوئی۔ پھر کچھ فاصلے حائل رہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ دھند کبھی دیوار نہ بن سکی۔ میرے لئے تعلق خاطر کا یہ عجیب کربناک سا رشتہ تھا۔ جیسے بھیگی ہوئی لکڑی سلگ رہی ہو۔ اس کی کوئی رومانی تخلیق نظر پڑتی تو نظر چمک اٹھتی۔ کوئی "طوفانی چیز" دیکھتا تو دل بیٹھ جاتا۔ نظر ملتی تو نظریات ٹکرانے لگتے' نہ اس کو جیب میں رکھ سکتے نہ جیل میں۔ قدم اس کے ساتھ نہ چل سکے' مگر دل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ جس طرح دوسری عالمی جنگ میں' ہم ہندوستانی سپاہی---- انگریز کی فوج میں جرمنی کی فتح کے لئے لڑتے رہے۔ ایک مرتبہ اوسلو (ناروے) کی ایک تقریب میں----- افغانستان کے مسئلے پر---- ہماری جھڑپ بھی ہو گئی۔ میں نے اس کو "روس" سمجھا اور اس نے مجھے "دقیانوس" مگر جب غلط فہمی رفع ہوئی تو دونوں نے اپنا غصہ "اوقیانوس" میں تھوک دیا تھا۔ کسی مسئلے پر اختلافات کا یہ مطلب نہیں کہ محاسن کی گواہی بھی نہ دی جائے۔

فوج کے حوالے سے فراز کی ایک نظم کا بڑا چرچا ہوا۔ ہم بھی اس پر بڑے "لال پیلے" ہوئے۔ مگر جب میں نے اس کے لخت جگر سعدی کو کپتانی کی وردی میں پاکستان کی سرحدوں پر سینہ سپر دیکھا' تو میں حیران رہ گیا۔ وہ اگر فوج کے خلاف ہوتا تو اپنے بیٹے کو فوج میں کیوں بھیجتا۔ وہ دراصل مارشل لاء کے خلاف تھا۔ ایوب خان اور یحیٰی خان کے "مارشل لاؤں" میں بھی اگرچہ وہ "نرم چٹکیاں" لیتا رہا۔ مگر ضیاء الحق کے مارشل لاء میں اس کے صبر کا پیمانہ اس طرح چھلکا کہ وہ خود بھی چھلک کر برطانیہ میں جا پڑا۔ فراز اور میں----- ان دنوں----- پاکستان نیشنل سنٹر کے سررشتے میں---- رفیق کار تھے' جس کی نوعیت ابلاغی تھی یعنی

ہم تو زندہ ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

فراز کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ مگر وہ محکمے کے "میڈیائی فرائض" سے واضح طور پر "الرجک" اور "ڈونگ نپاؤ" نظر آتا تھا۔ مارے باندھے اگر کوئی کام کرتا بھی تو اس میں ضرور "مینگیناں" ڈال دیتا۔ محکمے کے سربراہ جناب احمد حسن شیخ سے اکثر کہا کرتا "شیخ صاحب! مجھے سامنے سے اٹھا کر کسی کونے کھدرے میں ڈال دیجئے!"——— اسی کشمکش میں اس کی برطرفی کی نوبت آ گئی۔ اور اس نے برطانیہ میں جا کر "مارشل لاء" کے خلاف محاذ کھول لیا۔

فراز کی حب الوطنی کے ایک مظاہرے پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ محب الوطن ہے۔ یہ نومبر ۱۹۹۳ء کی بات ہے ہم لوگ اسلام آباد کے ایک ادبی اجتماع میں کشمیر کے مسئلے پر ایک قرارداد کی حمایت میں اہل قلم کے دستخط حاصل کر رہے تھے۔ قرارداد میں کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کرتے ہوئے بھارت سے مجلس اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق اس مسئلے کے تصفیے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

فراز کے بارے میں بعض دوست متذبذب تھے۔ میں کاغذ لے کر فراز کے پاس گیا تو اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ تقریباً" چنگھاڑتے ہوئے بولا——— "یہ کیا لکھ لائے ہو بابا۔ قراردادوں سے کچھ نہیں ہو گا میں دستخط نہیں کرتا۔" میں سمجھا وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مگر پھر جب یہ کہتے ہوئے———— "یہ قرارداد بڑی بے جان ہے۔ لہجہ معذرت خواہانہ ہے۔ ہمیں کشمیر کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ "اسرٹ" (Assert) کرنا ہو گا۔"———— تو اس کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوا۔ وہیں ایک صاحب نے بتایا کہ فراز نے اس مسئلے پر بمبئی میں———— Zee. T.V. پروگرام "سرحد" میں اپنے مدمقابل ہندوستان کے دکیلوں (سنیل دت، کلدیپ نیر، کرتار سنگھ دگل اور عارف محمد خان) کو کھری کھری سنائیں۔ یہ "لال پیلا انٹرویو"———— دیکھنے سننے سے تعلق رکھتا ہے———— کہنا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی حب الوطنی کے بارے میں سوئے ظن کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں اور اس عمل میں لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔

فراز سے بہت لوگ دراصل اس لئے بھی خفا ہیں، جن میں میں بھی شامل رہا کہ یہ آتش فشاں کیوں ہے۔ "ایش ٹرے" (Ashtray) کیوں نہیں، "موم بتی" کیوں نہیں۔ اس کے بعض نظریات سے نظریاتی بنیادوں پر اختلاف بھی ہو تو کم از کم اس بات کا تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے مقام پر بڑی استقامت کے ساتھ کھڑا رہا۔ اور بولنے کے وقت خاموش نہیں رہا۔ ایسے

لوگوں کو --- اختلافات کے باوجود---- احترام کا خراج دینا پڑتا ہے۔ آدمی دانت کا درد برداشت نہیں کر سکتا' لوگ فراز سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ وطن کا درد خاموشی سے برداشت کر لیتا۔ فراز کچھ ایسا صحیح نہ سہی' مگر اس کی خوش قسمتی یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تھے۔

فراز کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نیشنل سنٹر کی "ہم دفتری" کے زمانے میں ملا۔ وہ مجھے اپنا "برادر" ہی معلوم ہوا کہ گویا ملازمت کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا۔ مگر اس کو معمولات کا حیرت انگیز حد تک پابند پایا۔ اس کی دفتری تحریر کے الفاظ روشن۔ مستحکم اور دو ٹوک ہوتے۔ انگریزی کے بیچوں بیچ اردو فارسی اشعار کا ترشح خشک دفتری مثلوں کو ایک ادبی چاشنی بخش دیتا۔ محکمے کی "کوارٹر ماسٹری" میرے سپرد تھی۔ دفاتر کو---- کاغذ' قلم دوات میز کرسیوں سے لیس رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ ایک مرتبہ فراز نے کچھ چیزیں طلب کیں۔ میں نے لکھ بھیجا۔

تن ہمہ داغ داغ شد　　　　پنبہ کجا کجا نہم

فائل پر چپڑاسی کے بواپسی ہاتھ لکھا ہوا جواب ملا

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

گفتگو میں اس کے چٹکلوں اور پھلجڑیوں سے' جو ادب کی چاندنی سے تابدار ہوتیں' دفتر کی بساط واقعی زعفران زار بنی رہتی۔ فراز کے پر رعب "مشاعراتی [illegible]" سے تو ملک بھر کے ادبی حلقے واقف ہیں مگر اس کے معرکے کے ادبی لطیفے جو دفتروں کی فائلوں میں ہی دفن ہو گئے' ان کی برجستگی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

اس کا پہلا مشاعراتی جملہ' ہم نے ایبٹ آباد کے مشاعرے میں سنا۔ حفیظ صاحب اپنی طویل نظم "رقاصہ" سنا رہے تھے۔ نظم ختم ہونے میں نہ آئی تو ناگاہ فراز کا آوازہ ابھرا---- "حفیظ صاحب انصتروا شعر مکرر ارشاد ہو" اور---- آگے ہوئے سامعین کے قہقہے کانوں تک گونج گئے ۔ لوگ بڑے حفیظ صاحب جیسے تنک مزاج سینئر شاعر کے ساتھ اس لڑکے کی جسارت پر حیران تو ہوئے مگر اس کی شگفتہ ذہانت پر نہال اور ممنون بھی ہوئے۔

اس کی گفتگو بے حد دلچسپ' نکتہ آفرینی کی ایک رنگین خوبصورت پھلواری ہوتی ہے۔ صحیح بات عموماً صحیح محل پر کہتا ہے لیکن کبھی کبھی غلط بات کو صحیح وقت پر چھوڑنے میں تاخیر بھی کر دیتا ہے۔ احمد فراز کے رومانوں کا بڑا چرچا ہے مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ دراصل اپنے آپ

سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔

فراز کی شاعری پر میں کوئی لمبی بات نہیں کروں گا۔ مجھے نقادوں کی طرح بات کرنی آتی ہی نہیں۔ مجھے تو اس کے بارے میں بنیادی طور پر یہ سیدھی بات کہنی ہے کہ ہم نے اپنے زمانے میں جن دو چار شعراء کو بچشم خود قطرے سے سمندر اور ذرے سے "راکا پوشی" اور "کے ٹو" وغیرہ بنتے دیکھا ان میں احمد فراز ایک الگ تمکنت رکھتا ہے۔ اور بیکن نے فراز جیسے شاعروں ہی کے لئے کہا ہے کہ ان کی خوبصورتی ہی ان کے لئے بہترین سفارشی خط ہوتی ہے۔ فنی موشگافیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ میں یہ کہوں گا کہ فراز کی شاعری بیک وقت گلاب کا پھول بھی ہے اور آگ کا الاؤ بھی۔ صوفیا کی طرح اس کی شاعری کا پیرہن ہلکا اور خیالات وزنی ہوتے ہیں---- وہ آنکھ کی شاعری بھی کرتا ہے اور دماغ کی بھی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی آنکھ والی شاعری زیادہ مرغوب ہے کہ یہ درخت کی طرح---- اس کی زمین سے اگتی---- اس میں مہکتی---- زندگی میں پھلتی اور زبانوں پہ پھیلتی پھولتی چلی جاتی ہے۔

اس کی شاعری زندہ دلوں سے زیادہ مردہ دلوں کے لئے ضروری ہے۔ یہ توانائی اور تنوع کے اعتبار سے---- مختلف ذائقوں کے پانیوں کا ایک وسیع سمندر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو کس دھج سے زندہ رہنا چاہئے۔

مجھے اس کی شاعری سے تسکین نہیں ملتی---- خواہشات میں تحریک اور تجدید کا احساس ہوتا ہے---- خون میں دفعتاً" کچھ نئی چنگاریاں شکارنے لگتی ہیں۔---- اس کے فن میں ٹھہراؤ نہیں۔ ٹھہراؤ آئے بھی کہاں سے کہ وہ تو اب اس عمر میں بھی اسی طرح بیس برس کا سا۔ انقلابی انڈر گریجویٹ ہے۔ نوجوان ہے' جو دماغ سے کچھ آگے ہی چلتا ہے۔ کیونکہ وہ ماضی کی تاریخ کے بجائے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی کتابوں کے مطالعہ سے نچلے معاشرتی طبقے کے آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فراز اس کے لئے اونچے طبقے میں جگہ خالی کروا رہا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنویت پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مصرعوں کو انگور کی بیلوں کی طرح تراشتا ہے تاکہ پھل زیادہ اترے اور ذائقہ زیادہ "سوادا" ہو۔ یہ تو اس کے فن کا اعجاز ہوا' جس نے اس کی شاعری کو شہد کی طرح میٹھا اور چاندنے کی طرح تیز اور پُر حرارت کر دیا ہے۔ فکر کے اعتبار سے اس کو دنیا کے ان شعراء کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے بنی نوع انسان کی غلامی کو کم کیا ہے۔

عموماً" دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر شاعری میں "سچ" زیادہ ہو تو آرٹ (آرٹ) کم ہو جاتا

ہے۔ مگر فراز کے کمال فن نے "سچ" اور "آرٹ" دونوں کو انتہائی خوبصورتی سے شیر و شکر کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر یہ سچ ہے کہ زندگی کی جنگ لفظوں سے لڑی جاتی ہے تو---- مزاحمت اور آسودگی---- زندگی کے دونوں محاذوں پر فراز کی پیش قدمی میں کوئی کلام نہیں۔ اس کی شاعری کا ایک رنگ کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسرا رنگ اگرچہ کام تو کرتا ہے مگر کام کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ زندگی کا فوٹو گرافر نہیں' مصور ہے۔ مجھے تو اس کی شاعری شبہات کا ایک مفصل سوالیہ سفر معلوم ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی اس کی وہ کلیدی انفرادیت ہے۔ جس نے فراز کی شاعری کو اس عصر کے اجتماعی شعور کا عہد نامہ بنا دیا ہے۔

ایسے شعراء تو بہت ہیں کہ لوگ ان کا لکھا ہوا چاؤ سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر فراز کو---- فیض اور جالب کی طرح---- جو بات دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کچھ ایسے کام بھی کر گیکہ لوگ اس کو محبت سے یاد بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں میں اپنے ایک تاثر کو واضح طور پر بیان کر سکوں یا نہ کر سکوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ فراز اس قسم کی شاعری کرتا ہے جس کے لئے خود شاعری تخلیق ہوئی ہے۔ تاریخ میں اس کا شمار ان شعراء میں ہو گا۔ "جن کے دل سے" علامہ اقبال کے ایک قول کے مطابق---- قومیں جنم لیتی ہیں---- اس عہد کے ایک بے حد مقبول اور اتنے ہی متنازعہ شاعر کی حیثیت سے فراز کی حمایت اور مخالفت میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ ملک میں نہ اس کے پرستاروں کا شمار ممکن ہے نہ اختلاف کرنے والوں کی کمی ہے---- بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سے اختلاف بھی رکھتے ہیں اور اس کو پسند بھی کرتے ہیں۔ سو' اس تناظر میں احمد فراز کو نہ ہمارا ادب فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہماری تاریخ۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء

سید ضمیر جعفری

○

عرضِ غم کبھی اُس کے روبرو بھی ہو جائے
شاعری تو ہوتی ہے، گفتگو بھی ہو جائے

زخمِ ہجر بھرنے سے یاد تو نہیں جاتی
کچھ نشاں تو رہتے ہیں، دل رفو بھی ہو جائے

رند ہیں بھرے بیٹھے اور مے کدہ خالی
کیا بنے جو ایسے میں ایک "ہو" بھی ہو جائے

میں اِدھر تنِ تنہا اور اُدھر زمانہ ہے
وائے گر زمانے کے ساتھ، تو بھی ہو جائے

پہلی نامرادی کا دکھ کہیں بسرتا ہے
بعد میں اگر کوئی سُرخ رُو بھی ہو جائے

دین و دل تو کھو بیٹھے اب فرازؔ کیا غم ہے
کُوئے یار میں غارت آبرو بھی ہو جائے

○

جب تجھے یاد کریں کارِ جہاں کھینچتا ہے
اور پھر عشق وہی کوہِ گراں کھینچتا ہے

کسی دشمن کا کوئی تیر نہ پہنچا مجھ تک
دیکھنا اب کے مرا دوست کماں کھینچتا ہے

عہدِ فرصت میں کسی یارِ گذشتہ کا خیال
جب بھی آتا ہے تو جیسے رگِ جاں کھینچتا ہے

دل کے ٹکڑوں کو کہاں جوڑ سکا ہے کوئی
پھر بھی آوازہ ء آئینہ گراں کھینچتا ہے

انتہا عشق کی کوئی نہ ہوس کی کوئی
دیکھنا یہ ہے کہ حد کون ، کہاں کھینچتا ہے

کھنچے جاتے ہیں رسن بستہ غلاموں کی طرح
جس طرف قافلہ ء عمرِ رواں کھینچتا ہے

ہم تو رہوارِ زبوں ہیں وہ مقدر کا سوار
خود ہی مہمیز کرے خود ہی عناں کھینچتا ہے

رشتہ ء تیغ و گلو اب بھی سلامت ہے فراز
اب بھی مقتل کی طرف دل سا جواں کھینچتا ہے

○

کل ہم نے بزم یار میں کیا کیا شراب پی
صحرا کی تشنگی تھی سو دریا شراب پی

اپنوں نے تج دیا ہے تو غیروں میں جا کے بیٹھ
اے خانماں خراب! نہ تنہا شراب پی

تو ہم سفر نہیں ہے تو کیا سیر گلستاں
تو ہم سبو نہیں ہے تو پھر کیا شراب پی

اے دل گرفتہ ء غم جاناں سبو اٹھا
اے کشتہ ء جفائے زمانہ شراب پی

دو صورتیں ہیں یارو دردِ فراق کی
یا اُس کے غم میں ٹوٹ کے رو یا شراب پی

اک مہرباں بزرگ نے یہ مشورہ دیا
دکھ کا کوئی علاج نہیں ، جا شراب پی

بادل گرج رہا تھا اُدھر محتسب اِدھر
پھر جب تلک یہ عقدہ نہ سلجھا شراب پی

اے تو کہ تیرے در پہ ہیں رندوں کے جمگھٹے
اک روز اس فقیر کے گھر آ، شراب پی

دو جام ان کے نام بھی اے پیرِ میکدہ
جن رفتگاں کے ساتھ ہمیشہ شراب پی

کل ہم سے اپنا یار خفا ہو گیا فرازؔ
شاید کہ ہم نے حد سے زیادہ شراب پی

○

جس کے لئے ہیں جاں بلب، اس کو نہیں ملال بھی
اے دلِ ناصبور اب عادتِ ہجر ڈال بھی

دامنِ یار تک کہاں عشقِ زبوں کی دسترس
حشمتِ حسن دیکھ کر بھول گیا سوال بھی

کب سے ہیں لوگ سربکف، راہ میں مثلِ آہواں
اب تو مرے شکار خُو، تیر و کماں سنبھال بھی

جس کے بغیر روز و شب سخت بھی تھے محال بھی
اس کے بغیر کٹ گئے کس طرح ماہ و سال بھی

انجم و مہر و ماہتاب ، سرو و صنوبر و گلاب
کس سے تجھے مثال دوں، ہو تو کوئی مثال بھی

اس کے خرامِ ناز سے ایسی قیامتیں اٹھیں
اب کے تو مات کھا گئی چرخِ کہن کی چال بھی

ہم کو تو عمر کھا گئی خیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خدوخال بھی

اب کے فرازؔ وہ ہوا جس کا نہ تھا گمان تک
پہلی سی دوستی تو کیا ختم ہے بول چال بھی

○

چلی ہے شہر میں کیسی ہوا اداسی کی
سبھی نے اوڑھ رکھی ہے ردا اداسی کی

لباسِ غم میں تو وہ اور بن گیا قاتل
سجی ہے کیسی ، کسی پر قبا اداسی کی

غزل کہوں تو خیالوں کی دھند میں مجھ سے
کرے کلام کوئی اپسرا اداسی کی

خیالِ یار کا بادل اگر کھلا بھی کبھی
تو دھوپ پھیل گئی جا بجا اداسی کی

بہت دنوں سے تری یاد کیوں نہیں آئی
وہ میری دوست مری ہمنوا اداسی کی

فرازؔ نے تجھے دیکھا تو کس قدر خوش تھا
پھر اس کے بعد چلی وہ ہوا اداسی کی

○

کل نالہ ء قمری کی صدا تک نہیں آئی
کیا ماتمِ گل تھا کہ صبا تک نہیں آئی

آدابِ خرابات کا کیا ذکر یہاں تو
رندوں کو بہکنے کی ادا تک نہیں آئی

تجھ ایسے مسیحا کے تغافل کا گلہ کیا
ہم جیسوں کی پُرسش کو قضا تک نہیں آئی

جلتے رہے بے صرفہ، چراغوں کی طرح ہم
تو کیا، ترے کوچے کی ہوا تک نہیں آئی

کس جادہ سے گزرا ہے مگر قافلہ ء عمر
آوازِ سگاں، بانگِ درا تک نہیں آئی

اس در پہ یہ عالم ہوا دل کا کہ لبوں پر
کیا حرفِ تمنا کہ دعا تک نہیں آئی

دعوائے وفا پر بھی طلب دادِ وفا کی
اے کشتہ ء غم تجھ کو حیا تک نہیں آئی

جو کچھ ہو فرازؔ اپنے تئیں، یار کے آگے
اس سے تو کوئی بات بنا تک نہیں آئی

◆

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

اب مہ و سال کی مہلت نہیں ملنے والی
آ چکے اب تو شب و روز عذابوں والے

اب تو سب دشنہ و خنجر کی زباں بولتے ہیں
اب کہاں لوگ محبت کے نصابوں والے

جو دلوں پر ہی کبھی نقب زنی کرتے تھے
اب گھروں تک چلے آئے وہ نقابوں والے

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں
فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

نہ مرے زخم کھلے ہیں نہ ترا رنگِ حنا
اب کے موسم ہی نہیں آئے گلابوں والے

یوں تو لگتا ہے کہ قسمت کا سکندر ہے فرازؔ
مگر انداز ہیں سب خانہ خرابوں والے

◆

ہم کہ منت کشِ صیاد نہیں ہونے کے
وہ جو چاہے بھی تو آزاد نہیں ہونے کے

دیکھ آ کر کبھی ان کو بھی جو تیرے ہاتھوں
ایسے اجڑے ہیں کہ آباد نہیں ہونے کے

وصفِ مے اور صفتِ یار کے مضموں کے سوا
ناصحا! تیرے سخن یاد نہیں ہونے کے

یارِ بدعہد کا کتنا بڑا احساں ہے کہ ہم
اب کسی کے لئے برباد نہیں ہونے کے

اس جفا جو کو دعا دو کہ اگر وہ نہ رہا
پھر کسی سے ستم ایجاد نہیں ہونے کے

آج پھر جشن منایا گیا آزادی کا
کل گھروں پر کئی افراد نہیں ہونے کے

اتنے آرام طلب ہو تو محبت میں فرازؔ
میر بن جاؤ گے فرہاد نہیں ہونے کے

○

پھر تیرے نہ آنے کی خبر شام میں آئی
زہراب کی تلخی سی مرے جام میں آئی

اے کاش نہ پورا ہو کوئی بھی مرا ارماں
یہ اور تمنا ، دل ناکام میں آئی

کیا کیا نہ غزل اس کی جدائی میں کہی ہے
بربادی ء جاں بھی تو کسی کام میں آئی

کچھ تیرا سراپا مرے اشعار میں اُترا
کچھ شاعری میری ، ترے انعام میں آئی

کب تک غمِ دوراں مجھے فتراک میں رکھتا
آخر کو تو دنیا بھی مرے دام میں آئی

کل شام کہ تھا شیخِ حرم، صاحبِ محفل
صہبا کی پری جامہ ء احرام میں آئی

ہر چند فرازؔ ایک فقیرِ سرِ رہ ہوں
پر مملکتِ حرف مرے نام میں آئی

○

نہ تیرا قرب نہ بادہ ہے کیا کیا جائے
پھر آج دکھ بھی زیادہ ہے کیا کیا جائے

ہمیں بھی عرضِ تمنا کا ڈھب نہیں آتا
مزاجِ یار بھی سادہ ہے کیا کیا جائے

کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوش پھرتے ہیں
کچھ اپنا دل بھی کشادہ ہے کیا کیا جائے

وہ مہرباں ہے مگر دل کی حرص بھی کم ہو
طلب ، کرم سے زیادہ ہے کیا کیا جائے

نہ اس سے ترکِ تعلق کی بات کر پائیں
نہ ہمدمی کا ارادہ ہے کیا کیا جائے

سلوکِ یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فرازؔ
مگر یہ محفلِ اعداء ہے کیا کیا جائے

* * *

میں مر مٹا تو وہ سمجھا یہ انتہا تھی مری
اسے خبر ہی نہ تھی، خاک کیمیا تھی مری

میں چپ ہوا تو وہ سمجھا کہ بات ختم ہوئی
پھر اس کے بعد تو آواز جا بجا تھی مری

جو طعنہ زن تھا مری پوششِ دریدہ پہ
اسی کے دوش پہ رکھی ہوئی قبا تھی مری

میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں، یہی سزا تھی مری

شکست دے گیا اپنا غرور ہی اس کو
وگرنہ اس کے مقابل بساط کیا تھی مری

کہیں دماغ کہیں دل کہیں بدن ہی بدن
ہر اک سے دوستی یاری جدا جدا تھی مری

کوئی بھی کوئے محبت سے پھر نہیں گزرا
تو شہرِ عشق میں کیا آخری صدا تھی مری؟

جو اب گھمنڈ سے سر کو اٹھائے پھرتا ہے
اسی طرح کی تو مخلوق خاکِ پا تھی مری

ہر ایک شعر نہ تھا در خورِ قصیدہ دوست
اور اس سے طبعِ رواں خوب آشنا تھی مری

میں اُس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فرازؔ
یہ زندگی سے تعارف کی ابتدا تھی مری

○

شہرِ محبت ، ہجر کا موسم ، عہدِ وفا اور میں
تو تو اس بستی سے خوش خوش چلا گیا، اور میں؟

تو جو نہ ہو تو جیسے سب کو چپ لگ جاتی ہے
آپس میں کیا باتیں کرتے رات، دیا اور میں

سیرِ چمن عادت تھی پہلے اب مجبوری ہے
تیری تلاش میں چل پڑتے ہیں باد صبا اور میں

جس کو دیکھو تیری ہوا میں پاگل پھرتا ہے
ورنہ ہم مشرب تو نہیں تھے خلقِ خدا اور میں

ایک تو وہ ہمراز مرا ہے، پھر تیرا مداح
بس تیرا ہی ذکر کیا کرتے ہیں ضیاء☆ اور میں

ایک زمانے بعد فرازؔ یہ شعر کہے میں نے
اک مدت سے ملے نہیں ہیں یار مرا اور میں

☆ ضیاء الدین ضیاء

○

جانے نشّے میں کہ وہ آفتِ جاں خواب میں تھا
جیسے اک فتنہ ء بیدار، رواں خواب میں تھا

وہ سرِ شام، سمندر کا کنارا، ترا ساتھ
اب تو لگتا ہے کہ جیسے یہ سماں خواب میں تھا

جیسے یادوں کا دریچہ کوئی وا رہ جائے
اک ستارہ مری جانب نگراں خواب میں تھا

جب کھلی آنکھ تو میں تھا مری تنہائی تھی
وہ جو تھا قافلہ ء ہمسفراں خواب میں تھا

ایک شب ایک سرائے میں مکیں تھے دونوں
میں تو سویا ہی نہیں، وہ بھی کہاں خواب میں تھا

ایسے قاتل کو کوئی ہاتھ لگاتا ہے فرازؔ
شُکر کر شُکر کہ وہ دشمنِ جاں خواب میں تھا

○

نہیں کہ نامہ بروں کو تلاش کرتے ہیں
ہم اپنے بے خبروں کو تلاش کرتے ہیں

محبتوں کا بھی موسم ہے جب گذر جائے
سب اپنے اپنے گھروں کو تلاش کرتے ہیں

سنا ہے کل جنہیں دستارِ افتخار ملی
وہ آج اپنے سروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ عشق کیا ہے کہ اظہارِ آرزو کے لئے
حریفؔ نوحہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ ہم جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں قتل گاہوں کو
دراصل چارہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

رہا ہوئے پہ عجب حال ہے اسیروں کا
کہ اب وہ اپنے پروں کو تلاش کرتے ہیں

فرازؔ داد کے قابل ہے جستجو ان کی
جو ہم سے دربدروں کو تلاش کرتے ہیں

○

وہ جو آ جاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پیڑ گرتا ہے تو آ جاتے ہیں آرے لے کر

وہ جو آسودۂ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم
اب کے موج آئی تو پلٹے گی کنارے لے کر

ایسا لگتا ہے کہ ہر موسمِ ہجراں میں بہار
ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر

شہر والوں کو کہاں یاد ہے وہ خواب فروش
پھرتا رہتا تھا جو گلیوں میں غبارے لے کر

نقدِ جاں صرف ہوا کلفتِ ہستی میں فرازؔ
اب جو زندہ ہیں تو کچھ سانس ادھارے لے کر

○

آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی
مریم سی وہ لُعبت بھی تو بازار کی نکلی

دیکھو کبھی مقتل کبھی گلزار لگے ہے
تصویر عجب کوچہ ء دلدار کی نکلی

آنکھوں کی تسلی نہیں ہوتی تو نہ ہووے
ہم خوش ہیں کوئی شکل تو دیدار کی نکلی

کیوں یار کے انکار سے افسردہ ہے اے دل
نادان! کوئی راہ تو اقرار کی نکلی

وہ گریہ کناں اور دلاسا میں اسے دوں
کیا طرفہ طبیعت مرے غم خوار کی نکلی

وا رہنے دے یارب درِ توبہ کہ ابھی تو
حسرت ہی کہاں تیرے گنہگار کی نکلی

کل ہجر کی شب، روزِ قیامت کی طرح تھی
دن نکلا نہ جاں ہی ترے بیمار کی نکلی

○

کرتے بھی کیا، جانا پڑا پھر سے اُسی قاتل کے پاس
ہم بارہا ہو آئے ہیں چارہ گرانِ دل کے پاس

کچھ بے گھر کی سیپیاں کچھ بے مسافر کشتیاں
دریا نے رخ بدلا تو کیا باقی رہا ساحل کے پاس

جن جن کو تھا زعمِ وفا، پندارِ جاں، دعوائے دل
محفل سجی تو جمع تھے سب صاحبِ محفل کے پاس

اس عشق و ترکِ عشق میں ناصح کہاں سے آ گیا
یہ اختیار آنکھوں کا ہے یہ فیصلہ ہے دل کے پاس

سعدیؔ و حافظؔ بھی سہی مسند نشینانِ غزل
لیکن کلیدِ میکدہ ہے غالبؔ و بیدلؔ کے پاس

کیا خضر اور کیا راہبر حیران ہیں اس بات پر
کیوں خوش نشیں ہے قافلہ اک راندہء منزل کے پاس

○

کسی سے دل کی حکایت کبھی کہا نہیں کی
وگرنہ زندگی ہم نے بھی کیا سے کیا نہیں کی

ہر اک سے کون محبت نباہ سکتا ہے
سو ہم نے دوستی یاری تو کی، وفا نہیں کی

شکستگی میں بھی پندارِ دل سلامت ہے
کہ اس کے در پہ تو پہنچے مگر صدا نہیں کی

شکایت اس کی نہیں ہے کہ اُس نے ظُلم کیا
گلہ تو یہ ہے کہ ظالم نے انتہا نہیں کی

وہ نادہند اگر تھا تو پھر تقاضا کیا
کہ دل تو لے گیا قیمت مگر ادا نہیں کی

عجیب آگ ہے چاہت کی آگ بھی کہ فرازؔ
کہیں جلا نہیں کی اور کہیں بجھا نہیں کی

○

مسافرت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں
کوئی بھی خواب ہو تعبیر گھر کی دیکھتے ہیں

وطن سے دور بھی آزادیاں نصیب کسے
قدم کہیں بھی ہوں زنجیر گھر کی دیکھتے ہیں

اگرچہ جسم کی دیوار گرنے والی ہے
یہ سادہ لوح کہ تعمیر گھر کی دیکھتے ہیں

کوئی تو زخم اسے بھولنے نہیں دیتا
کوئی تو یاد عناں گیر گھر کی دیکھتے ہیں

ہم ایسے خانہ بر انداز‘ کنجِ غربت میں
جو گھر نہیں تو تصاویر گھر کی دیکھتے ہیں

بنائے دل ہے کسی خوابگاہِ زلزلہ پر
سو اپنی آنکھوں سے تقدیر گھر کی دیکھتے ہیں

فرازؔ جب کوئی نامہ وطن سے آتا ہے
تو حرف حرف میں تصویر گھر کی دیکھتے ہیں

○

وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ

ہم نے اک عمر بسر کی ہے غم یار کے ساتھ
میر دو دن نہ جئے ہجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پہ عزتِ سادات بھی دستار کے ساتھ

اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

ایک تو خواب لئے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

شہر کا شہر ہی ناصح ہو تو کیا کیجئے گا
ورنہ ہم رند تو بھڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ

ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چُن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

جو شرف ہم کو ملا کوچہ ء جاناں سے فرازؔ
سوئے مقتل بھی گئے ہیں اسی پندار کے ساتھ

○

تیرا غم اپنی جگہ دنیا کے غم اپنی جگہ
پھر بھی اپنے عہد پر قائم ہیں ہم اپنی جگہ

کیا کریں یہ دل کسی کی ناصحا سنتا نہیں
آپ نے جو کچھ کہا اے محترم، اپنی جگہ

ہم موحّد ہیں بتوں کے پوجنے والے نہیں
پر خدا لگتی کہیں تو وہ صنم اپنی جگہ

یارِ بے پروا! کبھی ہم نے کوئی شکوہ کیا
ہاں مگر ان ناسپاس آنکھوں کا نم اپنی جگہ

محفلِ جاناں ہو، مقتل ہو کہ میخانہ فرازؔ
جس جگہ جائیں بنا لیتے ہیں ہم اپنی جگہ

○

کیوں طبیعت کہیں ٹھہرتی نہیں
دوستی تو اُداس کرتی نہیں

ہم ہمیشہ کے سیر چشم سہی
تجھ کو دیکھیں تو آنکھ بھرتی میں

شبِ ہجراں بھی روزِ بد کی طرح
کٹ تو جاتی ہے پر گزرتی نہیں

شعر بھی آیتوں سے کیا کم ہیں
ہم پہ مانا وحی اترتی نہیں

اس کی رحمت کا کیا حساب کریں
بس ہمیں سے حساب کرتی نہیں

یہ محبت ہے، سن! زمانے سُن!
اتنی آسانیوں سے مرتی نہیں

جس طرح تم گزارتے ہو فرازؔ
زندگی اس طرح گزرتی نہیں

○

اس کی نوازشوں نے تو حیران کر دیا
میں میزبان تھا مجھے مہمان کر دیا

اک نوبہارِ ناز کے ہلکے سے لمس نے
میرے تو سارے جسم کو گلدان کر دیا

کل اک نگارِ شہرِ سبا نے بہ لطفِ خاص
مجھ سے فقیر کو بھی سلیمان کر دیا

جینے سے اِس قدر بھی لگاؤ نہ تھا مجھے
تُو نے تو زندگی کو، مری جان کر دیا

قُربت کے پل وہ اتنا سخی تھا کہ اس نے تو
پُورا تمام عُمر کا نُقصان کر دیا

نا آشنائے لطفِ تصادم کو کیا خبر
میں نے ہوا کی زد پہ رکھا جان کر، دیا

اتنے سکوں کے دن کبھی دیکھے نہ تھے فرازؔ
آسودگی نے مجھ کو پریشان کر دیا

○

اک شام ہے انتظار جیسی
اک یاد ہے یادِ یار جیسی

اک درد ہے نخلِ جاں چراغاں
اک آگ سی ہے چنار جیسی

اک زخم گلاب سا کھلا ہے
اک دل کی چبھن ہے خار جیسی

اک نقش ہے وہم کی طرح کا
اک شکل ہے اعتبار جیسی

اک روپ کہ آئینہ ترخ جائے
اک دھوپ رخِ نگار جیسی

اک راہ گزر ہے آسماں تک
اک کاہکشاں غبار جیسی

اک ہجر کا روگ عمر بھر کا
اک عمر کہ ہے ادھار جیسی

اک خواب کہ کچھ سمجھ نہ آئے
اک دھند ہے کوہسار جیسی

اک لُعبتِ سنگ، سر بہ زانو
اک زلف ہے آبشار جیسی

اک ساز لہو اگل رہا ہے
اک طرز فغاں ستار جیسی

اک شعلہ ء حُسن جل بجھا ہے
اک آنکھ ہے شرمسار جیسی

اک شاخ پہ چُپ اُداس قُمری
اک نغمہ سرا ہزار جیسی

اک گیت پہاڑیوں کا جھرنا
اک چیخ لہو کی دھار جیسی

اک تیر کہ دل میں ہے ترازو
اک تیغ جگر کے پار جیسی

اک وعدہ ء دوست حرف عیسیٰ
اک ساعتِ صبر دار جیسی

اک حلقہ ء رنگ طوق آسا
اک قوسِ قزح حصار جیسی

ایک ایک شعاع نوکِ نشتر
ایک ایک کرن کٹار جیسی

اک باغِ مُراد اُجڑ رہا ہے
اک دھوم سی ہے بہار جیسی

اک عہد فرازؔ جی کے دیکھا
اک رت بھی نہ آئی پیار جیسی

* * *

لگتا ہے کہ اب چاہتیں آساں ہیں زیادہ
عُشاق ہیں کم، چاک گریباں ہیں زیادہ

اک آدھ کوئی صاحبِ دل بھی ہے فروکش
اب کوچہ ء دلدار میں درباں ہیں زیادہ

مدت سے کوئی جانبِ مقتل نہیں آیا
قاتل بھی توقع سے پشیماں ہیں زیادہ

جس تاج کو دیکھو وہی کشکول نما ہے
اب کے تو فقیروں سے بھی سلطاں ہیں زیادہ

ہر ایک کو دعویٰ ہے یہاں چارہ گری کا
اب دل کے اُجڑ جانے کے امکاں ہیں زیادہ

کیا کیا نہ غزل اس کی جدائی میں کہی ہے
ہم پر شبِ ہجراں ترے احساں ہیں زیادہ

لوگوں نے تو جو زخم دیئے تھے سو دیئے تھے
کچھ تیرے کرم ہم پہ مری جاں ہیں زیادہ

مشاطہ ء دنیا سے کہے کون فرازؔ اب
ہم یار کی زلفوں سے پریشاں ہیں زیادہ

○

ہم اہلِ دل کو بھی کردار کیا دیے گئے ہیں
کہ زخم کھاتے گئے ہیں، دعا دیے گئے ہیں

ہم اپنی آبلہ پائی پہ منفعل تو نہیں
جو تیزرو تھے انہیں راستا دیے گئے ہیں

کہاں سے حوصلہ لاتے پیمبروں جیسا
سو کیا یہ کم ہے کہ شاعر بنا دیے گئے ہیں

جہانِ عشق سے کیا دل سا تاجدار گیا؟
جو شہرِ درد کے پرچم جھکا دیے گئے ہیں

تو کیا کوئی بھی تعلق نہیں رہا باقی
تو کیا وہ جتنے دیئے تھے بجھا دیے گئے ہیں

سو شہرِ غم کا کیا حال اب کہیں کہ وہاں
محبتوں کے صحیفے جلا دیے گئے ہیں

نئے زمانے میں آتے رہیں گے لوگ نئے
ہمارے نقشِ قدم بھی مٹا دیے گئے ہیں

○

کل پرسشِ احوال جو کی یار نے میرے
کس رشک سے دیکھا مجھے غم خوار نے میرے

بس ایک ترا نام چھپانے کی غرض سے
کس کس کو پکارا دلِ بیمار نے میرے

یا گرمیِ بازار تھی یا خوفِ زیاں تھا
پھر بیچ دیا مجھ کو خریدار نے میرے

ویرانی میں بڑھ کر تھے بیاباں سے تو پھر کیوں
شرمندہ کیا ہے در و دیوار نے میرے

جب شاعری پردہ ہے فرازؔ اپنے جنوں کا
پھر کیوں مجھے رسوا کیا اشعار نے میرے

◆

منزلیں ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں
مختلف ہو کے بھی سب زندگیاں ایک سی ہیں

کوئی قاصد ہو کہ ناصح، کوئی عاشق کہ عدو
سب کی اس شوخ سے وابستگیاں ایک سی ہیں

دشتِ مجنوں نہ سہی تیشۂ فرہاد سہی
سفرِ عشق میں واماندگیاں ایک سی ہیں

یہ الگ بات کہ احساس جدا ہوں ورنہ
راحتیں ایک سی، افسردگیاں ایک سی ہیں

صوفی و رند کے مسلک میں سہی لاکھ تضاد
مستیاں ایک سی، وارفتگیاں ایک سی ہیں

وصل ہو، ہجر ہو، قربت ہو کہ دوری ہو فرازؔ
ساری کیفیتیں، سب تشنگیاں ایک سی ہیں

○

چلو کہ کوچہ ء دلدار چل کے دیکھتے ہیں
کسے کسے ہے یہ آزار چل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ایسا مسیحا کہیں سے آیا ہے
کہ اس کو شہر کے بیمار چل کے دیکھتے ہیں

ہم اپنے بت کو، زلیخا لئے ہے یوسف کو
ہے کون رونقِ بازار چل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دیر و حرم میں تو وہ نہیں ملتا
سو اب کے اس کو سرِ دار چل کے دیکھتے ہیں

اس ایک شخص کو دیکھو تو آنکھ بھرتی نہیں
اس ایک شخص کو ہر بار چل کے دیکھتے ہیں

وہ میرے گھر کا کرے قصد جب تو سائے سے
کئی قدم در و دیوار چل کے دیکھتے ہیں

فرازؔ اسیر ہے اس کا کہ وہ فرازؔ کا ہے
ہے کون؟ کس کا گرفتار؟ چل کے دیکھتے ہیں

○

یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم
چارہ گر روئیں گے اور غم خوار بن جائیں گے ہم

ہم سرِ چاکِ وفا ہیں اور ترا دستِ ہنر
جو بنا دے گا ہمیں اے یار، بن جائیں ہم

کیا خبر تھی اے نگارِ شعر، تیرے عشق میں
دلبرانِ شہر کے دلدار بن جائیں گے ہم

سخت جاں ہیں پر ہماری اُستواری پر نہ جا
ایسے ٹوٹیں گے ترا اقرار بن جائیں گے ہم

اور کچھ دن بیٹھنے دو کوئے جاناں میں ہمیں
رفتہ رفتہ سایہء دیوار بن جائیں گے ہم

اس قدر آساں نہ ہو گی ہر کسی سے دوستی
آشنائی میں ترا معیار بن جائیں گے ہم

میرؔ و غالبؔ کیا کہ بن پائے نہیں فیضؔ و فراقؔ
زعم یہ تھا رومیؔ و عطارؔ بن جائیں گے ہم

دیکھنے میں شاخِ گُل لگتے ہیں لیکن دیکھنا
دستِ گلچیں کے لئے تلوار بن جائیں گے ہم

ہم چراغوں کو تو تاریکی سے لڑنا ہے فرازؔ
گُل ہوئے پر صبح کے آثار بن جائیں گے ہم

◆

غزل سن کر پریشاں ہو گئے کیا
کسی کے دھیان میں تم کھو گئے کیا

یہ بیگانہ روی پہلے نہیں تھی
کہو تم بھی کسی کے ہو گئے کیا

نہ پرسش کو نہ سمجھانے کو آئے
ہمارے یار ہم کو رو گئے کیا

ابھی کچھ دیر پہلے تک یہیں تھے
زمانہ ہو گیا تم کو گئے کیا

کسی تازہ رفاقت کی للک ہے
پرانے زخم اچھے ہو گئے کیا

پلٹ کر چارہ گر کیوں آ گئے ہیں
شبِ فرقت کے مارے سو گئے کیا

فرازؔ اتنا نہ اِترا حوصلے پر
اسے بھولے زمانے ہو گئے کیا

○

دو گھونٹ کیا پیے کہ بدن میں لگی ہے آگ
ساقی! شراب ہے کہ سبو میں بھری ہے آگ

تقدیر ہنس رہی ہے کہ میں سوختہ نصیب
جنگل میں آ گیا ہوں جو گھر میں لگی ہے آگ

جو ڈھونڈتے تھے آگ اُنھیں پیغمبری ملی
ہم کو پیمبری کی طلب تھی، ملی ہے آگ

اب باغ و باغباں سے کوئی کیا گلہ کرے
اب کے تو رنگِ گُل سے چمن میں لگی ہے آگ

جاناں ہم اہل درد کی تر چشمی نہ دیکھ
داماں کو دور رکھ کہ دلوں میں چھپی ہے آگ

محفل کو کیا خبر جو ہمارے دلوں میں ہے
کب شمع ساں ہمارے سروں پر دھری ہے آگ

آتش بجاں ہیں کب سے محبت میں ہم فرازؔ
اک بار جب لگی ہے تو پھر کب بجھی ہے آگ

○

جو بھی قاصد تھا وہ غیروں کے گھروں تک پہنچا
کوئی نامہ نہ ترے در بدروں تک پہنچا

مجھ کو مٹی کیا تو نے تو یہ احسان بھی کر
کہ مری خاک کو اب کُوزہ گروں تک پہنچا

اے خدا! ساری مسافت تھی رفاقت کے لئے
مجھ کو منزل کی جگہ ہمسفروں تک پہنچا

تو مہ و مہر لئے ہے مگر اے دستِ کریم
کوئی جگنو بھی نہ تاریک گھروں تک پہنچا

دل بڑی چیز تھا بازارِ محبت میں کبھی
اب یہ سودا بھی مری جان، سروں تک پہنچا

وقت قاروں کو بھی محتاج بنا دیتا ہے
وہ شہِ حُسن بھی دریوزہ گروں تک پہنچا

اتنے ناصح ملے رستے میں کہ توبہ توبہ
بڑی مشکل سے میں شوریدہ سروں تک پہنچا

اہل دنیا نے تجھی کو نہیں لوٹا ہے فرازؔ
جو بھی تھا صاحبِ دل، مفت بروں تک پہنچا

○

عاشقی بے دلی سے مشکل ہے
پھر محبت اُسی سے مشکل ہے

عشق آغاز ہی سے مشکل ہے
صبر کرنا ابھی سے مشکل ہے

ہم تن آساں ہیں اور ہمارے لئے
دشمنی، دوستی سے مشکل ہے

جس کو سب بے وفا سمجھتے ہوں
بے وفائی اسی سے مشکل ہے

ایک کو دوسرے سے سہل نہ جان
ہر کوئی، ہر کسی سے مشکل ہے

تو بضد ہے تو جا فرازؔ مگر
واپسی اُس گلی سے مشکل ہے

○

ملول کر ہمیں اتنا ملول کر جاناں
کہ ہم نہ یاد کریں تجھ کو بھول کر جاناں

ہیں مثلِ نامہ ء بے نام، دستِ قاصد میں
سو ہم سے در بدروں کو وصول کر جاناں

پھر آ گئے ترے کوچے میں خوش نگاہ ترے
غمِ جہاں کی صلیبوں پہ جھول کر جاناں

کبھی تو دستِ حنائی سے سرخی ء لب سے
ہمارے زخمِ تمنا کو پھول کر جاناں

یہ اہلِ درد تری مملکت میں رہتے ہیں
سو تُو خراج دلوں کے قبول کر جاناں

چلو وہ ترکِ تعلق کا فیصلہ ہی سہی
سو اختیار کوئی تو اصول کر جاناں

فرازؔ تجھ کو خداوند مانتا ہے، اسے
دیارِ عشق میں اپنا رسول کر جاناں

○

دل ٹھہرنے دے تو آنکھیں بھی جھپکتے جاویں
ہم کہ تصویر بنے بس تجھے تکتے جاویں

چوبِ نم خوردہ کی مانند سلگتے رہے ہم
نہ تو بجھ پائیں نہ بھڑکیں نہ دہکتے جاویں

تیری بستی میں ترا نام پتہ کیا پوچھا
لوگ حیران و پریشاں ہمیں تکتے جاویں

کیا کرے چارہ کوئی جب ترے اندوہ نصیب
منہ سے کچھ بھی نہ کہیں اور سسکتے جاویں

کوئی نشّے سے کوئی تشنہ لبی سے ساقی
تری محفل میں سبھی لوگ بہکتے جاویں

مژدہ ء وصل سے کچھ ہم ہی زخود رفتہ نہیں
اس کی آنکھوں میں بھی جگنو سے چمکتے جاویں

کبھی اس یارِ سمن بر کے سخن بھی سنیو
ایسا لگتا ہے کہ غنچے سے چٹکتے جاویں

ہم نوا سنجِ محبت ہیں ہر اک رُت میں فرازؔ
وہ قفس ہو کہ گلستاں ہو، چہکتے جاویں

○

ہیں زخم بہت اور بھی دل پر مرے آگے
کوئی نہ کہے اس کو ستمگر مرے آگے

آفات زمانے کے تعاقب میں مرے ہیں
اور مے ہے نہ مینا ہے نہ ساغر مرے آگے

کیوں جھگڑوں فرشتوں کے لکھے پر کہ یہی کھیل
ہوتا رہا دنیا میں بھی اکثر مرے آگے

تو ساتھ چمن میں ہو تو پھر رشک کے مارے
پھرتے ہیں کئی سرو و صنوبر مرے آگے

صیّاد نے پہلے تو رہائی کی خبر دی
پھر ڈال دیئے اس نے مرے پر مرے آگے

گو تیرہ مقدر ہوں مگر کیسی شکایت
ہیں کانچ کے ٹکڑے مہ و اختر مرے آگے

گمراہِ زمانہ ہوں مگر راہِ وفا میں
پوچھے نہ خضر کو بھی سکندر مرے آگے

وہ صاحبِ دل ہوں کہ مری جان کا دشمن
تعظیم سے رکھ دیتا ہے خنجر مرے آگے

وہ مستِ ازل ہوں کہ مرا کاتبِ تقدیر
لکھتا ہے مری لوحِ مقدر مرے آگے

وہ حرفِ صداقت ہوں کہ ہر عہدِ ستم میں
ہے ساغرِ سم قندِ مکرر مرے آگے

اے داورِ محشر نہ مری فردِ عمل دیکھ
اے ہاتفِ غیبی نہ سخن کر مرے آگے

اک ذرہ ء روزن ہے مرے واسطے خورشید
اک ریزہ ء مینا ہے سمندر مرے آگے

میں نے بھی کیا قصد سفر کا کہ غزل میں
غالبؔ سا طرحدار ہے رہبر مرے آگے

کس اسم کی برکت ہے کہ ایوانِ سخن میں
کھلتا ہی چلا جاتا ہے ہر در مرے آگے

○

کل شب تھا عجب دید کا منظر مرے آگے
دنیا تھی نہ ہونے کے برابر مرے آگے

جیسے متلاطم ہو سمندر مرے اندر
جیسے ہو کوئی ماہِ منور مرے آگے

اس وقت نہ تھی آنکھ جھپکنے کی بھی فرصت
اک شہرِ طلسمات تھا یکسر مرے آگے

اس وقت نہ تھا دل کو دھڑکنے کا بھی یارا
اک عالمِ حیرت تھا سراسر مرے آگے

خدام بسرگام لئے جام ستادہ
لب بستہ کنیزانِ سمن بر مرے آگے

لائے کوئی مینائے مے تند لپک کر
رکھ دے کوئی تعظیم سے ساغر مرے آگے

چھپ چھپ کے کوئی چست کرے تنگ قبا کو
ہنس ہنس کے اتارے کوئی زیور مرے آگے

اک مست ادا کاکل مشکیں کو بکھیرے
لے آئی دف و چنگ اٹھا کر مرے آگے

جیسے ہو مرے سامنے شدّاد کی جنت
جیسے ہو صنم خانہ ء آذر مرے آگے

جیسے کوئی گل چہرہ پری چھم سے اتر آئے
اور رقص کرے ناز سے آ کر مرے آگے

شعلہ سا بدن زلف کی مخمل میں لپیٹے
جیسے ہو کوئی خواب سا پیکر مرے آگے

یوں جیسے کہ جادو سا جگاتا چلا جائے
اک آفتِ جاں فتنہ ء محشر مرے آگے

یاقوت سے لب سرو سا قد رات سی آنکھیں
وہ جانِ قیامت تھی مرے گھر مرے آگے

وہ کیفیتِ دل تھی کہ بہزاد کا فن کیا
حافظؔ کی غزل بھی تھی فرو تر مرے آگے

اے گردشِ دوراں ذرا آہستہ قدم رکھ
یہ ساعتِ گزراں ہے گھڑی بھر مرے آگے

اے موسمِ ہجراں ابھی کچھ دیر توقف
آتا ہے تو آ جانا ٹھہر کر مرے آگے

آسودگی ء قرب کی اعضا شکنی سے
ہے نیند میں غافل مرا دلبر مرے آگے

اے صبحِ جدائی ابھی رک جا کہ ستمگر
ایسے بھی نہ جاگے تھے مقدر مرے آگے

شائد کہ فرازؔ آج کسی روپ نگر سے
آئی ہے قضا بھیس بدل کر مرے آگے

○

نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
کس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے، جانتے ہیں
دامِ دنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے

میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک؟
مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

دل نہ مانے بھی تو ایسا ہے کہ گاہے گاہے
یارِ بے فیض سے ہلکا سا ملال اچھا ہے

لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

رہروانِ رہِ الفت کا مقدر معلوم
ان کا آغاز ہی اچھا نہ مآل اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ، پر یہ حقیقت ہے فرازؔ
تیری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے

○

دشتِ افسردہ میں اک پھول کھلا ہے سو کہاں
وہ کسی خوابِ گریزاں میں ملا ہے سو کہاں

ہم نے مدت سے کوئی ہجو نہ واسوخت کہی
وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان سے گلہ ہے سو کہاں

ہم تری بزم سے اٹھے بھی تو خالی دامن
لوگ کہتے ہیں کہ ہر دکھ کا صلہ ہے سو کہاں

آنکھ اسی طور برستی ہے تو دل رستا ہے
یوں تو ہر زخم قرینے سے سلا ہے سو کہاں

بارہا کوچہ ء جاناں سے بھی ہو آئے ہیں
ہم نے مانا کہیں جنت بھی وِلا ہے سو کہاں

جلوہ ء دوست بھی دھندلا گیا آخر کو فرازؔ
ورنہ کہنے کو تو غمِ دل کی جلا ہے سو کہاں

○

ہم بھی مانگیں مراد ہو کچھ تو
جب رہا تیرے بعد ہو کچھ تو

کیسے پیماں کہاں کے قول و قرار
اُس ستمگر کو یاد ہو کچھ تو

کفر ہے، بے جواز ہے پینا
تُو ہو یا ابر و باد، ہو کچھ تو

کیوں ابھی سے گلہ تغافل کا
ملنا جلنا زیاد ہو کچھ تو

آؤ رو لیں فرازؔ دنیا کو
خوش دلِ نامراد ہو کچھ تو

○

کچھ ہمیں اس سے جان کر نہ کھلے
ہم یہ سب بھید تھے دگرنہ کھلے

جی میں کیا کیا تھی حسرتِ پرواز
جب رہائی ملی تو پر نہ کھلے

آگے خواہش تھی خون رونے کی
اب یہ مشکل کہ چشمِ تر نہ کھلے

ہو تو ایسی ہو پردہ داری ء زخم
حال دل کا بھی آنکھ پر نہ کھلے

سخت تنہا تھے اس کی بزم میں ہم
رنگِ محفل کو دیکھ کر نہ کھلے

کتنے خوش ہو فراز اسیری پر
اور یہ بندِ غم اگر نہ کھلے؟

○

وحشتِ دل ، طلبِ آبلہ پائی لے لے
مجھ سے یارب! مرے لفظوں کی کمائی لے لے

عقل ہر بار دکھاتی تھی جلے ہاتھ اپنے
دل نے ہر بار کہا، آگ پرائی لے لے

میں تو اس صبحِ درخشاں کو تونگر جانوں
جو مرے شہر سے کشکولِ گدائی لے لے

تو غنی ہے مگر اتنی ہیں شرائط تیری
وہ محبت جو ہمیں راس نہ آئی لے لے

ایسا نادان خریدار بھی کوئی ہو گا
جو ترے غم کے عوض ساری خدائی لے لے

اپنے دیوان کو گلیوں میں لیے پھرتا ہوں
ہے کوئی جو ہنرِ زخم نمائی لے لے

میری خاطر نہ سہی اپنی انا کی خاطر
اپنے بندوں سے تو پندارِ خدائی لے لے

اور کیا نذر کروں اے غمِ دلدارِ فرازؔ
زندگی جو غمِ دنیا سے بچائی لے لے

○

چشمِ گریاں میں وہ سیلاب تھے اے یار کہ بس
گرچہ کہتے رہے مجھ سے مرے غم خوار کہ بس

گھر تو کیا گھر کی شباہت بھی نہیں ہے باقی
ایسے ویران ہوئے ہیں در و دیوار کہ بس

زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقت تیری
ایک اک سانس نے وہ وہ دیے آزار کہ بس

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اس بار کہ بس

اب وہ پہلے سے بلا نوش و سیہ مست کہاں
اب تو ساقی سے یہ کہتے ہیں قدح خوار کہ بس

لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فرازؔ
ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس

* * *

اتنے بھی تو وہ خفا نہیں تھے
جیسے کبھی آشنا نہیں تھے

مانا کہ بہم کہاں تھے ایسے
پر یوں بھی جدا جدا نہیں تھے

تھی جتنی بساط ، کی پرستش
تم بھی تو کوئی خدا نہیں تھے

حد ہوتی ہے طنز کی بھی آخر
ہم تیرے نہیں تھے، جا نہیں تھے

کس کس سے نباہتے رفاقت
ہم لوگ کہ بے وفا نہیں تھے

رخصت ہوا وہ تو میں نے دیکھا
پھول اتنے بھی خوشنما نہیں تھے

تھے یوں تو ہم اس کی انجمن میں
کوئی ہمیں دیکھتا‘ نہیں تھے

جب اس کو تھا مان خود پہ کیا کیا
تب ہم بھی فرازؔ کیا نہیں تھے

◆

تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے
ہم نوا گر، خوش رہے جیسے بھی حالوں میں رہے

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

دیکھنا اے رہ نوردِ شوق! کوئے یار تک
کچھ نہ کچھ رنگِ حنا پاؤں کے چھالوں میں رہے

ہم سے کیوں مانگے حسابِ جاں کوئی جب عمر بھر
کون ہیں، کیا ہیں، کہاں ہیں؟ ان سوالوں میں رہے

بدظنی ایسی کہ غیروں کی وفا بھی کھوٹ تھی
سوئے ظن ایسا کہ ہم اپنوں کی چالوں میں رہے

ایک دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
یار مکتب کی کتابوں کے حوالوں میں رہے

عشق میں دنیا گنوائی ہے نہ جاں دی ہے فرازؔ
پھر بھی ہم اہلِ محبت کی مثالوں میں رہے

○

شعار اپنا ہی جس کا بہانہ سازی تھا
وہ میرے جھوٹ سے خوش تھا نہ سچ پہ راضی تھا

تمام عمر اسی کے رہے یہ کیا کم ہے
بلا سے عشق حقیقی نہ تھا مجازی تھا

یہ دو دلوں کی قرابت بڑی گواہی ہے
سو کیا ہوا کوئی شاہد نہ کوئی قاضی تھا

نہ طنز کر کہ کئی بار کہہ چکا تجھ سے
وہ میری پہلی محبت تو میرا ماضی تھا

نہ دوست یار، نہ ناصح، نہ نامہ بر، نہ رقیب
بلا کشانِ محبت سے کون راضی تھا

یہ گُل شدہ سی جو شمعیں دکھائی دیتی ہیں
ہنر ان آنکھوں کا آگے ستارہ سازی تھا

عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا
کوئی فرازؔ سا کافر نہیں تھا غازی تھا

○

یوں دل سے کسی درد کا پیماں نہیں کرتے
اب جاں پہ بنی بھی ہے تو درماں نہیں کرتے

ہر یاد کو یوں زخم بناتے نہیں دل کا
ہر تیر کو پیوستِ رگِ جاں نہیں کرتے

یہ مسئلہ اب اہلِ محبت کا ہے اپنا
مرتے ہیں تو کچھ آپ پہ احساں نہیں کرتے

خط لائیں نہ لائیں ترا، ہم نامہ بروں کو
بس دیکھتے رہتے ہیں پریشاں نہیں کرتے

ایسا بھی تو رکھتے نہیں خنجر پہ گلو کو
اتنا بھی تو قاتل کو پشیماں نہیں کرتے

کب شمعیں جلاتا ہے شبِ ماہ میں کوئی
تو آئے تو ہم گھر میں چراغاں نہیں کرتے

لوگوں کو گماں تک نہیں ہوتا ہے جنوں کا
ہم دل کی طرح چاک گریباں نہیں کرتے

ہم تج کے چلے آتے ہیں یارو درِ جاناں
غالبؔ کی طرح منتِ درباں نہیں کرتے

○

دل سلگتا ہے مگر سوختہ جانی کم ہے
شعر کیا ہوں کہ طبیعت میں روانی کم ہے

زیست اک آدھ محبت سے بسر ہو کیسے؟
رات لمبی ہو تو پھر ایک کہانی کم ہے

تجھ سے کہنا تو نہیں چاہیے پر کہتے ہیں
ہم نے بھی دولتِ جاں اب کے لٹانی کم ہے

دل کو کیا روئیں کہ جب سوکھ گئی ہوں آنکھیں
شہر ویراں ہے کہ دریاؤں میں پانی کم ہے

ہم نے اندوہِ زمانہ سے نہ غم کھایا تھا
شائد اب یوں ہے کہ آشوبِ جوانی کم ہے

جس طرح سانحے گزرے ہیں تری جاں پہ فرازؔ
اس کو دیکھیں تو یہ آشفتہ بیانی کم ہے

○

جو چل سکو تو کوئی ایسی چال چل جانا
مجھے گماں بھی نہ ہو اور تم بدل جانا

یہ شعلگی ہو بدن کی تو کیا کیا جائے
سو لازمی تھا ترے پیرہن کا جل جانا

تمہیں کرو کوئی درماں، یہ وقت آ پہنچا
کہ اب تو چارہ گروں کو بھی ہاتھ مل جانا

ابھی ابھی تو جدائی کی شام آئی تھی
ہمیں عجیب لگا زندگی کا ڈھل جانا

سجی سجائی ہوئی موت زندگی تو نہیں
مورخوں نے مقابر کو بھی محل جانا

یہ کیا کہ تو بھی اسی ساعتِ زوال میں ہے
کہ جس طرح ہے سبھی سورجوں کو ڈھل جانا

ہر ایک عشق کے بعد اور اس کے عشق کے بعد
فرازؔ اتنا بھی آساں نہ تھا سنبھل جانا

◆

اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا

ڈھلتی نہ تھی کسی بھی جتن سے شبِ فراق
اے مرگِ ناگہاں! ترا آنا بہت ہوا

ہم خلد سے نکل تو گئے ہیں پر اے خدا!
اتنے سے واقعے کا فسانہ بہت ہوا

اب ہم ہیں اور سارے زمانے کی دشمنی
اس سے ذرا سا ربط بڑھانا بہت ہوا

اب کیوں نہ زندگی پہ محبت کو وار دیں
اس عاشقی میں جان سے جانا بہت ہوا

اب تک تو دل کا دل سے تعارف نہ ہو سکا
مانا کہ اس سے ملنا ملانا بہت ہوا

کیا کیا نہ ہم خراب ہوئے ہیں مگر یہ دل
اے یادِ یار تیرا ٹھکانہ بہت ہوا

کہتا تھا ناصحوں سے مرے منہ نہ آئیو
پھر کیا تھا ایک "ہو" کا بہانہ بہت ہوا

لو پھر ترے لبوں پہ اسی بے وفا کا ذکر
احمد فرازؔ! تجھ سے کہا نا، بہت ہوا

○

ہم سنائیں تو کہانی اور ہے
یار لوگوں کی زبانی اور ہے

چارہ گر روتے ہیں تازہ زخم کو
دل کی بیماری پرانی اور ہے

جو کہا ہم نے وہ مضموں اور تھا
ترجماں کی ترجمانی اور ہے

ہے بساطِ دل لہو کی ایک بوند
چشمِ پرخُوں کی روانی اور ہے

نامہ بر کو کچھ بھی ہم پیغام دیں
داستاں اس نے سنائی اور ہے

آب زمزم دوست لائے ہیں عبث
ہم جو پیتے ہیں وہ پانی اور ہے

سب قیامت قامتوں کو دیکھ لو
کیا مرے جاناں کا ثانی اور ہے؟

اہلِ دل کی انجمن میں آ کبھی
ان کی دنیا یار جانی اور ہے

شاعری کرتی ہے اک دنیا فرازؔ
پر تری سادہ بیانی اور ہے

○

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہمسفر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ترے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
یہ سیر چشم مگر کب ادھر کو دیکھتے ہیں

عجب فسونِ خریدار کا اثر ہے کہ ہم
اُسی کی آنکھ سے اپنے ہنر کو دیکھتے ہیں

کوئی مکاں کوئی زنداں سمجھ کے رہتا ہے
طلسم خانہ ء دیوار و در کو دیکھتے ہیں

فراز در خورِ سجدہ ہر آستانہ نہیں
ہم اپنے دل کے حوالے سے در کو دیکھتے ہیں

وہ بے خبر مری آنکھوں کا صبر بھی دیکھیں
جو طنز سے مرے دامانِ تر کو دیکھتے ہیں

یہ جاں کنی کی گھڑی کیا ٹھہر گئی ہے کہ ہم
کبھی قضا کو کبھی چارہ گر کو دیکھتے ہیں

ہماری در بدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

فراز ہم سے سخن دوست ، فال کے لئے بھی
کلامِ غالب آشفتہ سر کو دیکھتے ہیں

◆

گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دہن تم جیسے
کوئی کس منہ سے کرے تم سے سخن، تم جیسے

یہ مرا حسنِ نظر ہے تو دکھا دے کوئی
قامت و گیسو و رخسار و دہن تم جیسے

اب تو قاصد سے بھی ہر بات جھجک کر کہنا
لے گئے ہو مرا بے ساختہ پن تم جیسے

اب تو نایاب ہوئے دشمنِ دیرینہ تک
اب کہاں اے مرے یارانِ کہن، تم جیسے؟

کبھی ہم پر بھی ہو احساں کہ بنا دیتے ہو
اپنی آمد سے بیاباں کو چمن تم، جیسے

کبھی ان لالہ قباؤں کو بھی دیکھا ہے فرازؔ
پہنے پھرتے ہیں جو خوابوں کے کفن تم جیسے

○

کبھی جو راحتِ جاں تھا اسے بھلا بھی دیا
اگرچہ دل نے ہمیں طعنہء وفا بھی دیا

نہیں کہ ہم سفروں کے لئے بنے دیوار
جو برق پا تھے انہیں ہم نے راستا بھی دیا

مگر خدا کی سبھی بخشش انوکھی ہیں
وفا کے ساتھ ہمیں یارِ بے وفا بھی دیا

میں بت بنا اسے دیکھا کیا تو اُس نے کہا
گزر چکی ہے بہت رات اب بجھا بھی، دیا

فرازؔ جس نے دلوں کو اداسیاں بخشیں
اسی نے زخم چھپانے کا حوصلہ بھی دیا

○

اشک تعبیر اور خواب ہنسی
درد دریا ہے اور سراب ہنسی

کیا کروں عرضِ غم کہ پاس اس کے
میری ہر بات کا جواب ہنسی

خوار کر کے ہمیں محبت میں
زندگی خانماں خراب ، ہنسی

اور کیا ہے یہ قلقلِ مینا
میرے دکھ دیکھ کر شراب ہنسی

تھی نظر متن پر خیال کہیں
مجھ پہ بے ساختہ کتاب ہنسی

اس پہ ظاہر ہوا نہ حال مرا
میں ہنسا ایسی کامیاب ہنسی

عشق میں آنسوؤں کے باب ہیں سب
ہے کہاں شاملِ نصاب ہنسی

ہم تو پاگل تھے ٹوٹ کر روئے
خلق کیوں ہم پہ بے حساب ہنسی

○

زخم ہجراں کا بھر گیا کچھ کچھ
زہرِ غم کام کر گیا کچھ کچھ

عشق کے آخری مراحل میں
سچ کہوں میں بھی ڈر گیا کچھ کچھ

آج دشمن کی موت کا سن کر
یوں لگا میں بھی مر گیا کچھ کچھ

بے سبب محتسب نہیں خاموش
مال اس کے بھی گھر گیا کچھ کچھ

اب ترا دکھ نہیں رہا اتنا
جی محبت سے بھر گیا کچھ کچھ

○

یہ بے دلی ہے تو کشتی سے یار کیا اتریں
ادھر بھی کون ہے؟ دریا کے پار کیا اتریں؟

تمام دولتِ جاں ہار دی محبت میں
جو زندگی سے لئے تھے ادھار کیا اتریں

ہزار جام سے ٹکرا کے جام خالی ہوں
جو آ گئے ہیں دلوں میں غبار کیا اتریں

بسانِ خاک، سرِ کوئے یار بیٹھے ہیں
اب اس مقام سے ہم خاکسار کیا اتریں

نہ عطر و عود، نہ جام و سبو، نہ ساز و سرود
فقیرِ شہر کے گھر شہریار کیا اتریں

ہمیں مجال نہیں ہے کہ بام تک پہنچیں
انہیں یہ عار، سرِ رہ گزار کیا اتریں

جو زخم داغ بنے ہیں وہ بھر گئے تھے فرازؔ
جو داغ زخم بنے ہیں وہ یار کیا اتریں

◆

کسی کی یاد میں اتنا نہ رو ہوا سو ہوا
کہ دل گنوا کے اب آنکھیں نہ کھو، ہوا سو ہوا

کوئی اسے نہ سنائے ہمارا حالِ خراب
مبادا اس کو بھی افسوس ہو، ہوا سو ہوا

جدائیوں کے زمانوں کا پوچھتے کیا ہو
گزر گئی جو گزرنی تھی، جو ہوا سو ہوا

محبتوں میں عجب تو نہیں اجڑ جانا
سو مجھ کو دیکھ کے حیراں نہ ہو ہوا سو ہوا

ہزار اور بھی دکھ دل نے پال رکھے ہیں
چلو یہ عشق کا آزار تو ہوا سو ہوا

وفا میں ہم بھی کہاں ایسے خوش معاملہ تھے
فقط اسی سے گلہ کیوں کرو ہوا سو ہوا

فرازؔ خوش ہو متاعِ ہنر سلامت ہے
بلا سے عشق کی بازی میں جو ہوا سو ہوا

○

ہنگامہ ء محفل ہے کوئی دم کہ چلا میں
ساقی مرے ساغر میں ذرا کم کہ چلا میں

کچھ دیر کی مہمان سرائے ہے یہ دنیا
چلنا ہے تو چل اے مرے ہمدم، کہ چلا میں

پھر بات ملاقات کبھی ہو کہ نہیں ہو
پھر یار کہاں فرصتِ باہم کہ چلا میں

یہ سلسلہ ء آمدوشد کیا ہے کہ یارب!
اک شور نفس میں ہے دمادم کہ چلا میں

جو عمر گزاری ہے بڑی دھج سے گزاری
اب کوئی خوشی ہے نہ کوئی غم کہ چلا میں

یہ دل کا تپکنا کہ ٹھہرتا ہی نہیں ہے
یارو کوئی نشتر کوئی مرہم کہ چلا میں

اے دوست، فرازؔ ایک دیا ہے ترے در کا
کیا جانئے کہہ دے وہ کسی دم کہ چلا میں

○

نہ تو دیوانے ہی بن پائے نہ دانا مرے دوست
ہو گئے شہر کے لوگوں میں تماشا مرے دوست

اب جو آنکھیں ہیں بیاباں تو یہی ہونا تھا
جانے کس دشت کو روتے رہے دریا، مرے دوست

تو ہمیشہ سے رہا چشم و چراغ محفل
میں تو محفل میں بھی محفل میں نہیں تھا مرے دوست

اب بھی دل تجھ کو صدا دیتا ہے گاہے گاہے
مری جاں میری تمنا، میری دنیا، مرے دوست

تیری معصوم نگاہی پہ بھی حرف آئے گا
صرف مجھ کو ہی گنہگار نہ ٹھہرا مرے دوست

میں محبت کے قرینوں سے نہیں ہوں غافل
تجھ کو جانا ہے تو ہنس ہنس کے چلا جا مرے دوست

اب کے آشوبِ زمانہ تھا قیامت کا فرازؔ
کیسے کیسے مرے دشمن ہوئے کیا کیا مرے دوست

○

وہ تو پتھر پہ بھی گزرے نہ خدا ہونے تک
جو سفر میں نے نہ ہونے سے کیا، ہونے تک

زندگی! اس سے زیادہ تو نہیں عمر تری
بس کسی دوست کے ملنے سے جدا ہونے تک

ایک اک سانس مری رہن تھی دلدار کے پاس
نقدِ جاں بھی نہ رہا قرض ادا ہونے تک

مانگنا اپنے خدا سے بھی ہے دریوزہ گری
ہاتھ شل کیوں نہ ہوئے دستِ دعا ہونے تک

اب کوئی فیصلہ ہو بھی تو مجھے کیا لینا
میں تو کب سے ہوں سرِ دار، سزا ہونے تک

داورا!! تیری مشیت بھی تو شامل ہو گی
ایک اچھے بھلے انساں کے برا ہونے تک

دستِ قاتل سے ہوں نادم کہ لہو کو میرے
عمر لگ جائے گی ہمرنگِ حنا ہونے تک

دشت سے قلزمِ خوں تک کی مسافت ہے فرازؔ
قیس سے غالبِ آشفتہ نوا ہونے تک

○

خوش کون رہا پوششِ ہجراں کو پہن کر
سو تو بھی نہ میلا یہ ستارہ سا بدن کر

ہم سبزہ ء پامال ہیں کب در خورِ احساں
تو بادِ صبا ہے، گل و لالہ سے سخن کر

آوارہ نہ پھر، شامِ غریبی کے مسافر
آ اور مرے دل کی سرائے کو وطن کر

کس ظلم پہ آخر کو ہوئی تجھ کو بھی حیرت
کیوں دیکھ رہا ہے مجھے تصویر سی بن کر

بے جوششِ خوں، رنگِ محبت نہیں کھلتا
اے دشمنِ جاں، دل کو نہ محرومِ بدن کر

لب تشنہء خوں کب سے ہے اک اک مژہء یار
وا اے دہنِ زخمِ جگر، راہِ سخن کر

تیرا تو برا حال ہے پہلے سے زیادہ
لے اور فراز اس سے نہ ملنے کے جتن کر

○

نامہ تو ہم نے بھیجا ہے اس کو صبا کے ہاتھ
اب دیکھیے لگے نہ لگے آشنا کے ہاتھ

پھر یاد آ گئیں مجھے محرومیاں مری
دل بیٹھ سا گیا ہے دعا کو اٹھا کے ہاتھ

جانے کس آستیں سے پکارے مرا لہو
منصف عدالتوں میں ہیں بیٹھے چھپا کے ہاتھ

دنیا بھی تیرے ساتھ ہے دل بھی تری طرف
اب میرا تیرا فیصلہ ٹھہرا خدا کے ہاتھ

اس سرد مہر کی ستم ایجادیاں نہ پوچھ
جو تاپتا ہے، میرے خطوں کو جلا کے، ہاتھ

عمروں کی دوستی کا صلہ یہ ملا کہ وہ
رخصت ہوا تو بس یونہی رسما” ہلا کے ہاتھ

اے شکوہ سنجِ شدتِ اغیار، شکر کر
تجھ کو لگے نہیں ہیں کسی آشنا کے ہاتھ

تجدیدِ دوستی ہے تو اے میرے زُود رنج
تھوڑا سا مسکرا کے، ذرا سا بڑھا کے ہاتھ

چاکِ قبا پہ میری نظر تھی کہ یار نے
جلدی سے رکھ دیئے مری آنکھوں پہ آ کے ہاتھ

ساقی نے کتنے پیار سے دیکھا فرازؔ جب
مانگی شراب میں نے پیالہ بنا کے ہاتھ

○

پھرا ہوں سارے زمانے میں در بدر کیسا
میں تیرے بعد بھی زندہ رہا مگر کیسا

وہ جانتا تھا کہ کچھ روز وہ نہیں تھا تو میں
پکارتا رہا اس کو اِدھر اُدھر کیسا

نہ اعتبار نہ آسودگی نہ قرب ترا
فقط تکلفِ دیوار و در ہے، گھر کیسا

میں جس کے ہجر میں رویا ہوں پاگلوں کی طرح
وہ کل ملا تو ہنسا میرے حال پر کیسا

عزیز تر تھی جسے نیند شام وصل میں بھی
وہ تیرے ہجر میں جاگا ہے عمر بھر کیسا

بس ایک شخص کی خاطر بس ایک دل کے لئے
وطن کو تج دیا دیوانگی میں، گھر کیسا

کہاں کی دوستی، کیسا فراق، کون فرازؔ
میں خود کو بھول گیا تجھ کو بھول کر کیسا

○

کیوں نہ ہم عہدِ رفاقت کو بھلانے لگ جائیں
شائد اس زخم کو بھرنے میں زمانے لگ جائیں

نہیں ایسا بھی کہ اک عمر کی قُربت کے نشے
ایک دو روز کی رنجش سے ٹھکانے لگ جائیں

یہی ناصح جو ہمیں تجھ سے نہ ملنے کو کہیں
تجھ کو دیکھیں تو تجھے دیکھنے آنے لگ جائیں

ہم کہ ہیں لذتِ آزار کے مارے ہوئے لوگ
چارہ گر آئیں تو زخموں کو چھپانے لگ جائیں

ربط کے سینکڑوں حیلے ہیں، محبت نہ سہی
ہم ترے ساتھ کسی اور بہانے لگ جائیں

ساقیا! مسجد و مکتب تو نہیں میخانہ
دیکھنا، پھر بھی غلط لوگ نہ آنے لگ جائیں

قرب اچھا ہے مگر اتنی بھی شدت سے نہ مل
یہ نہ ہو تجھ کو مرے روگ پرانے لگ جائیں

اب فرازؔ آؤ چلیں اپنے قبیلے کی طرف
شاعری ترک کریں، بوجھ اٹھانے لگ جائیں

○

چاہت کے صبح و شام محبت کے رات دن
"دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن"

وہ شوقِ بے پناہ میں الفاظ کی تلاش
اظہار کی زبان میں لکنت کے رات دن

وہ ابتدائے عشق وہ آغازِ شاعری
وہ دشتِ جاں میں پہلی مسافت کے رات دن

سودائے آذری میں ہوائے صنم گری
وہ بت پرستیوں میں عبادت کے رات دن

اک سادہ دل ، دیار کرشمہ گراں میں گم
اک قریہ ء طلسم میں حیرت کے رات دن

لب ہائے نارسیدہ کی لرزش سے جاں بلب
صہبائے ناچشیدہ کی لذت کے رات دن

روئے نگار و چشمِ غزالیں کے تذکرے
گیسوئے یار و حرف و حکایت کے رات دن

ناکردہ کاریوں پہ بھی بدنامیوں کا شور
اختر شماریوں پہ بھی تہمت کے رات دن

سوداگرانِ منبر و مکتب سے رو کشی
جاں دادگانِ دانش و حکمت کے رات دن

اہلِ قبا و اہلِ ریا سے گریز پا
وہ واعظانِ شہر سے وحشت کے رات دن

میرؔ و انیسؔ و غالبؔ و اقبالؔ سے الگ
راشدؔ، ندیمؔ، فیضؔ سے رغبت کے رات دن

فردوسیؔ و نظیریؔ و حافظؔ کے ساتھ ساتھ
بیدلؔ، غنیؔ، کلیمؔ سے بیعت کے رات دن

شیلےؔ کا سحر، کیٹسؔ کا دکھ، بائرنؔ کی دھج
ان کافرانِ عشق سے نسبت کے رات دن

تشکیک و ملحدانہ رویے کے باوجود
رومیؔ سے والہانہ عقیدت کے رات دن

جیسے مئے سخن سے صراحی بھری ہوئی
زورِ بیان و حسنِ طبیعت کے رات دن

یاروں سے شاعرانہ حوالے سے چشمکیں
غیروں سے عاشقانہ رقابت کے رات دن

شعری سفر میں بعض بزرگوں سے اختلاف
پیرانِ میکدہ سے بغاوت کے رات دن

رکھ کر کتابِ عقل کو نسیاں کے طاق پر
وہ عاشقی میں دل کی حکومت کے رات دن

ہر روز، روزِ ابر تھا ہر رات چاند رات
آزاد زندگی تھی، فراغت کے رات دن

وہ صبح و شامِ در بدری، ہم سنوں کے ساتھ
آوارگی و سیر و سیاحت کے رات دن

اک محشرِ خیال کے ہجراں میں کاٹنا
تنہائی کے عذاب، قیامت کے رات دن

اک لُعبتِ جمال کو ہر وقت سوچنا
اور سوچتے ہی رہنے کی عادت کے رات دن

اک رازدارِ خاص کو ہر وقت ڈھونڈنا
بے اعتباریوں میں ضرورت کے رات دن

وہ ہر کسی سے اپنا ہی احوال پوچھنا
اپنے سے بھی تجاہل و غفلت کے رات دن

بے وجہ اپنے آپ کو ہر وقت کوسنا
بے سود ہر کسی سے شکایت کے رات دن

رسوائیوں کی بات تھی رسوائیاں ہوئیں
رسوائیوں کی عمر میں شہرت کے رات دن

اک دشمنِ وفا کو بھلانے کے واسطے
چارہ گروں کے پند و نصیحت کے رات دن

پہلے بھی جاں گُسل تھے مگر اس قدر نہ تھے
اک شہرِ بے اماں میں سکونت کے رات دن

اس دولتِ ہُنر پہ بھی آزارِ مفلسی
اس روشنی ء طبع پہ ظلمت کے رات دن

پھر یہ ہوا کہ شیوہ ء دل ترک کر دیا
اور تج دیئے تھے ہم نے محبت کے رات دن

ہر آرزو نے جامہ ء حسرت پہن لیا
پھر ہم تھے اور گوشہ ء عزلت کے رات دن

ناداں ہیں وہ کہ جن کو ہے گم نامیوں کا رنج
ہم کو تو راس آئے نہ شہرت کے رات دن

فکرِ معاش، شہر بدر کر گئی ہمیں
پھر ہم تھے اور قلم کی مشقت کے رات دن

”خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا“
اور مدعی تھے صنعت و حرفت کے رات دن

کیا کیا ہمیں نہ عشق سے شرمندگی ہوئی
کیا کیا نہ ہم پہ گزرے ندامت کے رات دن

آکاس بیل پی گئی اک سرو کا لہو
آسیب کھا گیا کسی قامت کے رات دن

کافی ہے ایک عمر اسی روزگار میں
برسوں پہ تھے محیط، اذیت کے رات دن

ساماں کہاں کہ یار کو مہماں بلایئے
امکاں کہاں کہ دیکھئے عشرت کے رات دن

پھرتے تھے میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہ تھا
قسمت میں جب تلک تھے قناعت کے رات دن

سو یہ بھی ایک عہدِ زیاں تھا، گزر گیا
کٹ ہی گئے ہیں جبرِ مشیت کے رات دن

نوواردانِ شہرِ تمنا کو کیا خبر
ہم ساکنانِ کوئے ملامت کے رات دن

○

پھرتے ہیں اب بھی دل کو گریباں کیے ہوئے
جن وحشیوں پہ ہیں ترے احساں کیے ہوئے

تجدیدِ عشق کیا ہو کہ برسوں گزر گئے
تجھ سے کوئی سخن بھی مری جاں کیے ہوئے

اب تجھ سے کیا گلہ ہو کہ اک عمر ہو گئی
ہم کو بھی قصدِ کوچہ ء جاناں کیے ہوئے

دل سے ہوئی ہے پھر ترے بارے میں گفتگو
تر آنسوؤں سے دیدہ و داماں کیے ہوئے

جی مانتا نہیں ہے کہ ہم بھی بھلا چکیں
تیری طرح سے وعدہ و پیماں کئے ہوئے

کچھ ضد میں ناصحوں کی تجھے چاہتے رہے
کچھ پاسداری ء دلِ ناداں کئے ہوئے

ہم وہ کہ تجھ کو شعر میں تصویر کر دیا
صورت گرانِ شہر کو حیراں کئے ہوئے

بازار سرد تھا نہ خریدار کم نظر
ہم خود تھے اپنے آپ کو ارزاں کئے ہوئے

اے عشق ہم سے اور بھی ہوں گے زمانے میں
اچھے بھلے گھروں کو بیاباں کئے ہوئے

کچھ ہم سے نامراد کہ پھرتے ہیں کوبکو
دل کو کسی فقیر کا داماں کئے ہوئے

وعدہ کیا تھا اس نے کسی شام کا کبھی
ہم آج تک ہیں گھر میں چراغاں کئے ہوئے

اب اس کے جور سے بھی گئے ہم کہ جب سے ہیں
اپنے کیے پہ اس کو پشیماں کیے ہوئے

یہ رتجگے قبول کہ آرام سے تو ہیں
رکھتے تھے ورنہ خواب، پریشاں کیے ہوئے

ہم وہ اسیر ہیں کہ زمانے گزر گئے
"بند اپنے آپ پر درِ زنداں کیے ہوئے"

ترکِ وفا کے بعد ہوس اختیار کی
اس کاروبار میں بھی ہیں نقصاں کیے ہوئے

جانِ فراز مرگِ تمنا کے باوجود
بھولے نہیں ہمیں ترے احساں کیے ہوئے

○

صد رنگِ چمن دیدہ ء حیراں میں پھرے تھا
جوں موسمِ گُل یار گلستاں میں پھرے تھا

وحشی کو ترے دشت نوردی نہیں بھولی
زنجیر بہ پا ہو کے بھی زنداں میں پھرے تھا

کرتے بھی تو ہم کیا کوئی تدبیر رفو کی
سوزن کی طرح درد دل و جاں میں پھرے تھا

شائد ہو تجھے یاد کہ اے صاحبِ محفل
اک سوختہ جاں بزم چراغاں میں پھرے تھا

کیا حال کہوں قلزمِ ہستی کے سفر کا
تنکے کی طرح نوح کے طوفاں میں پھرے تھا

یہ سچ ہے بدلنے میں زمانے نہیں لگتے
ہاں شیخ بھی کل صورتِ انساں میں پھرے تھا

مشکل سے ملے تم کو فرازؔ ایسا دوانہ
جو شہر میں رہ کر بھی غزالاں میں پھرے تھا

○

حیرت ہے لوگ اب بھی اگر خوش عقیدہ ہیں
ہم ساکنانِ قریہ ء آفت رسیدہ ہیں

اس سنگ زار میں ہنرِ آزری سے شرط
کتنے صنم ہیں جو ابھی نا آفریدہ ہیں

ہم حرف گر ہزار کہیں دل کے مرثیے
اُس بارگاہ میں تو سراپا قصیدہ ہیں

اہلِ جہاں ہماری روش سے ہیں بے خبر
ہم پیرہن دریدہ نہیں دل دریدہ ہیں

آتا ہے کب کوئی کسی آتش بجاں کے پاس
اچھا ہوا کہ آپ بھی دامن کشیدہ ہیں

اے زندگی اب اور کوئی تجربہ کہ ہم
تریاقِ عشق و زہرِ زمانہ چشیدہ ہیں

فرصت ملے تو آ مرے خلوت کدے میں سُن
دیوان میں کہاں جو سخن چیدہ چیدہ ہیں

ہم اہلِ دل سے اہلِ جہاں کے تعلقات
ہیں تو سہی فرازؔ مگر خط کشیدہ ہیں

○

دل بدن کا شریکِ حال کہاں
ہجر پھر ہجر ہے وصال کہاں

عشق ہے نام انتہاؤں کا
اس سمندر میں اعتدال کہاں

ایسا نشہ تو زہر میں بھی نہ تھا
اے غمِ دل تری مثال کہاں

ہم کو بھی اپنی پائمالی کا
ہے مگر اس قدر ملال کہاں

میں نئی دوستی کے موڑ پہ تھا
آ گیا ہے ترا خیال کہاں

دل کہ خوش فہم تھا سو ہے ورنہ
تیرے ملنے کا احتمال کہاں

وصل و ہجراں ہیں اور دنیائیں
ان زمانوں میں ماہ و سال کہاں

تجھ کو دیکھا تو لوگ حیراں ہیں
آ گیا شہر میں غزال کہاں

تجھ پہ لکھی تو سج گئی ہے غزل
آ ملا خواب سے خیال کہاں

اب تو شہہ مات ہو رہی ہے فرازؔ
اب بچاؤ کی کوئی چال کہاں

○

ایک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہنستا جاتا
کاش منزل سے بھی آگے کوئی رستا جاتا

اے مرے ابرِ گریزاں میری آنکھوں کی طرح
گر برسنا ہی تجھے تھا تو برستا جاتا

آج تک یاد ہے اظہارِ محبت کا وہ پَل
کہ مری بات کی لُکنت پہ وہ ہنستا جاتا

چلو پتھر نہ اُٹھاتے ترے دیوانے پہ لوگ
سرِ راہے کوئی آوازہ ہی کستا جاتا

اتنے محدود کرم سے تو تغافل بہتر
گر ترسنا ہی مجھے تھا تو ترستا جاتا

◆

وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سبھی رنگ آثار کے شہر کا
کوئی شخص تھا مرے شہر میں، کسی دور پار کے شہر کا

چلو کوئی دل تو اداس تھا چلو کوئی آنکھ تو نم رہی
چلو کوئی در تو کھلا رہا، شبِ انتظار کے شہر کا

کئی خوشبوئیں درِ دوست تک مرے ساتھ شمع بدست تھیں
مجھے پوچھنا نہ پڑا پتہ، مرے گُل عذار کے شہر کا

یہ جو میں نے تازہ غزل کہی سو ہے نذر اہلِ فراق کی
کہ نہ مل سکا کوئی نامہ بر مجھے میرے یار کے شہر کا

سو متاعِ جاں کو لئے ہوئے پلٹ آئے تیرے گرفتہ دل
کسے بیچتے کہ ملا نہیں کوئی اعتبار کے شہر کا

مری طرزِ نغمہ سرائی سے کوئی باغباں بھی تو خوش نہ تھا
یہ مرا مزاج ہے کیا کروں کہ میں ہوں بہار کے شہر کا

کسی اور دیس کی اور کو سنا ہے فرازؔ چلا گیا
سبھی دکھ سمیٹ کے شہر کے، سبھی قرض اتار کے شہر کا